قصیدہ

لفظ قصیدہ عربی لفظ قصدٌ سے بنا ہے، اس کے لغوی معنی قصد (ارادہ) کرنے کے ہیں۔ گویا قصیدے میں شاعر کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کا قصد کرتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی مغز کے ہیں یعنی قصیدہ اپنے موضوعات و مفاہیم کے اعتبار سے دیگر اصنافِ شعر کے مقابلے میں وہی نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو انسانی جسم و اعضا میں سر یا مغز کو حاصل ہوتی ہے۔ فارسی میں قصیدے کو "جامہ" بھی کہتے ہیں۔

قصیدہ ہیئت کے اعتبار سے غزل سے ملتا ہے۔ بحر شروع سے آخر تک ایک ہی ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور باقی اشعار کے آخری مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدے میں ردیف لازمی نہیں۔ قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے، بعض اوقات درمیان میں بھی مطلعے لائے جاتے ہیں۔ ایک قصیدے میں اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ ہے۔ زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر نہیں۔ اُردو اور فارسی میں کئی کئی سو اشعار کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔

ہیئت کے لحاظ سے قصیدے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تمہیدیہ:

Scanned with CamScanner

جس میں قصیدے کے چاروں اجزا (تشبیب، مدح، گریز، دعا
موجود ہوتے ہیں، دوسرا مدحیہ:۔ جو تشبیب اور گریز کے بغیر
راست مدح سے شروع ہوتا ہے۔

قصیدہ، ظاہری ہیئت کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہوتا ہے
مگر معانی و مفاہیم کے اعتبار سے عموماً چار اجزا پر مشتمل ہوتا ہے:

۱۔ تشبیب: قصیدے کا ابتدائی حصہ تشبیب کہلاتا ہے تشبیب
کے معنی ذکرِ شباب کے ہیں۔ مگر تشبیب کے لیے موضوع کی پابندی
نہیں ہوتی۔ تشبیب کے اشعار عموماً عشقیہ یا بہاریہ ہوتے ہیں
غزل کی ابتدائی شکل تشبیب تھی جسے بعد میں الگ صنفِ سخن
حیثیت دی گئی مگر تشبیب کو نفسِ مضمون سے زیادہ طویل نہیں
ہونا چاہیئے۔

۲۔ گریز: تشبیب کے بعد جب قصیدہ نگار اصل موضوع کا
تو اسے گریز کہتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ تشبیب اور قصیدے
اصل مضمون (مدح یا ذم وغیرہ) کو فنکاری سے ایک دوسرے
ملایا جاتے مثلاً شاعر تشبیب میں شکایتِ زمانہ کرتے ہوئے کہ
کہ اب ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ میں نے ایسے
کا دامن تھام لیا ہے جو دنیا میں سخاوت و فیاضی میں اپنی مثال

ہے۔ پھر شاعر ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا ہے۔ اچھی گریز قصیدے کی خوبی ہوتی ہے۔ تشبیب اور گریز میں ربط جتنا عمدہ اور فطری ہوگا قصیدہ اتنا ہی بلند پایہ سمجھا جائے گا۔ جیسے تعریف / تعریف کیا گیا

۳۔ مدح: اس حصے میں قصیدہ گو ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے، یعنی اس کی عظمت و شوکت، شرافت و نجابت، عدل و انصاف، شجاعت و بہادری، دینداری و خدا ترسی، قناعت و راست بازی اور علم دوستی وغیرہ۔ بعض اوقات ممدوح کے ساز و سامان مثلاً اس کے گھوڑے، تلوار، فوج اور ہاتھی وغیرہ کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

۴۔ دُعا: آخری حصے میں ممدوح کو دُعا دی جاتی ہے، بعض اوقات شاعر اپنی اچھی یا بُری حالت ظاہر کرتا ہے۔ دُعا کے ذریعے قصیدہ گو اپنا صلہ بھی طلب کرتا ہے۔ دعا قصیدے میں نازک مقام ہے اور قصیدے کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک دُعا پر ہوتا ہے۔ قصیدے کے مقطع میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔

ہر قصیدے میں ان تمام اجزا کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ بعض ایسے قصیدے بھی ملتے ہیں جن میں بغیر کسی تمہید کے مدح بیان ہوتی ہے۔

قصیدے کے لیے کوئی ایک موضوع متعین نہیں، اس میں مدح (تعریف) ذم (بُرائی) وعظ و نصیحت، اخلاق و حکمت اور حکایت و

شکایت وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ دراصل عربی قصیدے کے موضوعات میں بڑی وسعت تھی عربی شعراء عشقیہ واردات، قلبی احساسات اور اپنے ماحول و مناظر کو قصیدے کا موضوع بناتے تھے۔ مگر فارسی شاعروں نے قصیدے کو خوشامد اور حصولِ انعام کے لیے بادشاہوں کی تعریف یا ناراضی اور مایوسی میں ان کی مذمت تک محدود کر لیا۔ اُردو قصیدے کا سب سے بڑا موضوع مدح ہے۔ البتہ دیگر موضوعات پر بھی بہت سے قصیدے لکھے گئے ہیں۔

بعض لوگ ہجو کو ایک مستقل صنفِ سخن سمجھتے ہیں حالانکہ یہ قصیدے ہی کی ایک قسم ہے، جو نظم کسی کی مذمت، بُرائی یا عیوب کے بیان میں لکھی جائے، وہ ہجو یا ہجویہ قصیدہ کہلاتی ہے۔

قصیدے کی زبان عموماً پرشکوہ اور لہجہ بلند آہنگ ہوتا ہے۔ قصیدے کا سب سے بڑا موضوع مدح ہے لہٰذا کسی کی شان میں تعریف کے لیے الفاظ و تراکیب بھی پُر رعب اور باوقار ہونے چاہئیں، تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع میں جدّت طرازی، نُدرت اور مُبالغہ آمیزی ہو اور اندازِ بیان پُرزور و پُرجوش ہو تو قصیدہ زیادہ مؤثّر ہوگا۔

اچھا قصیدہ معنوی اعتبار سے بلند تخیل اور سچّے جذبات کا حامل ہوگا۔ اس کی زبان ابتذال، فحش گوئی، تعقید اور اجنبی محاورات سے پاک ہو

کا لقب دیا تھا۔

غالب نے صرف چار قصیدے لکھے۔ مگر ان کا معیار بہت بلند ہے۔ وہ انفرادیت پسند شاعر تھے اس لیے انھوں نے سودا اور ذوق کے برعکس آسان زمینوں میں قصیدے لکھے۔ ان قصیدوں کی تشبیب میں بڑی ندرت ہے۔ غالب کے قصیدے عبدالسلام ندوی کے بقول "اردو شاعری کا سرمایۂ ناز ہیں۔"

مومن نے بھی متعدد قصیدے لکھے مگر دو کے سوا اُن کے سب قصائد حمدیہ اور نعتیہ ہیں۔ انھوں نے صلے کی توقع کے لیے کبھی قصیدہ نہیں کہا۔ اُن کے ہاں حُسنِ عقیدت اور جوشِ اخلاص کی فراوانی ہے ان کی تشبیب عموماً نادر اور دلکش ہوتی ہے انھیں متعدد علوم میں یدطولیٰ حاصل تھا اس لیے ان کے قصیدوں میں علمی الفاظ و اصطلاحات کی کثرت ہے۔ انھوں نے قصیدے کو جھوٹی خوشامد سے پاک رکھا۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

بعد کے دَور میں محسن کاکوروی نے عمدہ نعتیہ قصیدے لکھے۔ عزیز لکھنوی کے مذہبی قصیدے قابلِ ذکر ہیں۔ منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی اور سحر لکھنوی وغیرہ نے بھی اچھے قصیدے لکھے۔

اُردو قصیدے پر مجموعی نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدے کو

تجھے وہ حامیٔ دنیا و دیں زمانے میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دیں کو تمکین
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت — صحیح ہے کہ قرآن ہو مع الیقین

(ذوق قصیدہ بہ تقریب غسل صحت بہادر شاہ ظفر)

دعائے طولِ عمر شہ پہ ہاتھ اٹھیں کیوں نہ لاکھوں — کہ ذات اس کی نمونہ ہے خدا کی مہربانی کا
رعیت شاد ملک آباد و آزاد تبرّت — ادا حق کر دیا شاہِ دکن نے حکمرانی کا

(حالی قصیدہ در تہنیت جشن سالگرہ چہل سالہ نظام دکن)

گلِ خوشرنگ رسولِ مدنی عربی — زیبِ دامانِ ادب طرۂ دستارِ دل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر، نخلِ دو عالم کا ثمر — بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

(محسن کاکوروی۔ قصیدہ بہاریہ نعتیہ)

مرثیہ

مرثیہ کس زبان کا لفظ ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ مرثیہ کی تعریف

مرثیہ عربی لفظ "رثا" سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں مرنے والے کی تعریف و توصیف۔ گویا مرثیہ ایسی صنفِ شعر ہے جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اور اس کی تعریف حسرت اور غم کے انداز میں کی جاتی ہے۔

ظاہری ہیئت کے اعتبار سے ابتدا میں مرثیے کی کوئی خاص شکل متعین

[illegible]

مرثیہ کئی طرح کا ہوتا ہے مثلاً وہ مرثیہ جو کسی شخص خصوصاً قومی رہنما
وغیرہ کی وفات پر اظہارِ غم کے طور پر لکھا جاتا ہے جیسے ہر سال یومِ اقبال
یا یومِ قائدِ اعظم کے موقع پر دونوں رہنماؤں کے متعلق نظمیں کہی جاتی ہیں۔
ایسے مرثیوں کی حیثیت عموماً رسمی ہوتی ہے۔ بعض اوقات مرثیہ کسی ایسی
عزیز ہستی کے متعلق ہوتا ہے جس سے انسان کو ذاتی یا خاندانی نسبت
ہو۔ مثلاً اقبال کا مرثیہ "والدہ مرحومہ کی یاد میں"۔ اس کے لیے ضروری ہے
کہ مرثیہ گہرائیوں سے نکلے ورنہ اس کی حیثیت رسمی مرثیے کی ہوگی۔ مرثیے
کی ایک شکل وہ ہے جس میں دینی رہنماؤں خصوصاً حضرت امام حسینؓ اور ان
کے خاندان اور شہدائے کربلا کا ذکر ہوتا ہے۔ انیس اور دبیر کے مرثیے

اسی نوعیت کے ہیں۔

مرثیہ تمام اصنافِ سخن میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اُردو شاعری میں مرثیہ وہ واحد صنفِ شعر ہے جو عربی یا فارسی شاعری سے مستعار نہیں (اُردو مرثیہ فارسی مرثیے سے بالکل ایک مختلف چیز ہے) یہ اُردو شعرا کی اپنی ایجاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں اس کی کوئی واضح شکل مقرر نہ تھی، میر انیس اور میرزا دبیر کے زمانے میں مرثیے نے ایک متعین اور واضح صورت اختیار کی۔ دوم:

مرثیے میں دیگر اصنافِ شعر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک مرکّب صنف ہے جس میں قصیدے کی طرح مختلف انسانوں اور چیزوں کی مدح کی جاتی ہے۔ مثنوی کی طرح واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور نظم کی طرح منظر نگاری اور غزل کی طرح جذبات نگاری ہوتی ہے، اس کے باوجود مرثیے کا انفرادی رنگ قائم رہتا ہے۔ سوم:

اُردو قصیدے اور مثنوی میں اگرچہ منظر نگاری اور مصوّری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی ان پر ہمیشہ داخلیت کا غلبہ رہا۔ مرثیہ پہلی بار خارجی رنگ کو اہمیت دی گئی۔ اس کے نتیجے میں مرثیے نے بیانی شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ چہارم:

مرثیوں میں جا بجا ایسے اخلاقی اشارے ملتے ہیں جن میں عام انسانوں

تفصیلات سے سامعین مختلف اثرات قبول کریں گے اور مرثیے کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔

۴۔ مرثیے کی زبان میں موقع محل کی مناسبت کا خیال رکھنا چاہیے۔

موضوعہ نمبر ۴

اُردو مرثیے کا سُراغ دکنی شعرا کے ہاں ملتا ہے، بعد کے دور میں بھی بیسیوں شاعروں نے مرثیے لکھے ان میں آبرو، میر ضاحک، سودا، میر، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، قائم چاند پوری وغیرہ اہم ہیں۔ سودا نے نگاری کی صورت و معنی میں بہت سے اضافے کیے۔ مرثیے کا ادبی سنوارا اور اسے ادبی وقار بخشا۔ سودا کے مرثیوں میں سیرت و کے نقوش، واقعات، مناظر کی تصویریں، زبان و بیان کی سادگی طرزِ اظہار کی شیرینی کی خوبیاں ملتی ہیں۔ سودا کے بعد میر، قائم چاند مصحفی اور میر حسن نے بھی اچھے مرثیے کہے۔ غالب نے زین العابدین خاں عارف کا درد انگیز مرثیہ لکھا۔

شاہانِ اودھ کے دور میں شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ شیعوں کی مخصوص رسوم اور عزاداری کے ساتھ مرثیہ گوئی کا رواج قدرتی تھا۔ اس دور میں یوں تو بے شمار شعرا نے مرثیے لکھے مگر اور ضمیر اور دلگیر اور فصیح نے اور پھر انیس اور دبیر نے مرثیے کو عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ خلیق کی زبان فصیح و سادہ ہے، میر ضمیر

بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیرِ تنگ تھی
ایک اک جنگ مالک اشتر کی جنگ تھی

(میر انیس)

جہاں تک مستقبل میں مرثیہ نگاری کا تعلق ہے اوّل تو میر انیس نے مرثیہ کو ترقی کی اس آخری انتہا (saturation) تک پہنچا دیا کہ اس میں کوئی نئی بات پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ دوسرے وہ ماحول، فضا اور زمانہ ہی نہیں رہا۔ جس میں مرثیہ نشوونما پا سکے لہٰذا مرثیے کی ترقی کے امکانات بہت کم ہیں۔

شہر آشوب

شہر آشوب کے لغوی معنی اور تعریف کریں؟

شہر آشوب کے لغوی معنی ہیں "شہر کے لیے فتنہ و ہنگامہ" یا شہر میں جمع ہونیوالے یا شہر میں فتنہ برپا کرنے والے۔" اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں، جس میں مختلف پیشوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کا ذکر ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں شہر آشوب وہ نظم ہے "جس میں شہر یا ملک کی اقتصادی یا سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف طبقوں کی مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ مزاحیہ، طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے شہر آشوب کی یہ تعریف کی ہے

شہر آشوب کے لیے کوئی ایک ہیئت مقرر نہیں، بہر ہیئت میں
شہر آشوب لکھے گئے ہیں۔ بعض شعرا کے ہاں آشوبیہ غزلیں ملتی ہیں
شہر آشوب میں شاعر کا انداز ہمدردانہ یا طنز و تضحیک اور ہجو کا ہوتا ہے
بعض اوقات شہر آشوب مرثیے اور نوحے کے انداز میں لکھے جاتے
ہیں۔ بعض شہر آشوبوں میں لفظی رعایتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔
شہر آشوب کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ جوں جوں شہر آشوب
نے ترقی کی اس کے مفہوم و موضوع میں بھی وسعت آتی گئی، اس صنف
شعر کے اہم موضوعات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ لڑکوں کا حسن و جمال جو باعثِ فتنہ ہو۔

۲۔ شہر یا ملک کی بربادی۔

۳۔ کاریگروں اور اہلِ حرفہ کی بے روزگاری۔

۴۔ شہر کی اقتصادی بدحالی۔

۵۔ سیاسی ابتری اور انتشار۔

قدیم ترکی اور فارسی ادب میں شہر آشوب کی بہت سی مثال
ملتی ہیں۔ محمد شاہ کے عہد میں سیاسی اور ملکی انتشار و ابتری
نتیجے میں اردو میں بڑی کثرت سے شہر آشوب لکھے گئے۔ ابتدا

میں شاکر ناجی، کمترین، حائم اور قائم نے شہر آشوب لکھے۔ شاکر ناجی کے شہر آشوب میں نادر شاہی حملے، دہلی کی بربادی اور ہندوستان کی فوج کی بزدلی کا ذکر ہے۔ سودا اور میر نے اسی کی تقلید کی۔ سودا کے ایک شہر آشوب کی ہیئت قصیدے کی ہے اور دوسرے کی مخمس کی۔ قصیدہ شہر آشوب ۹۶ اشعار کا ہے، جس میں عوام کی بیروزگاری، قلتِ معاش اور دہلی کی بربادی کا ذکر ہے۔ میر نے اپنے شہر آشوب میں اقتصادی بدحالی اور درباری ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔ میر و سودا کے شہر آشوب اپنے زمانے کی سیاسی فضا کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے شہر آشوب میں آگرے کی معاشی بدحالی، فوج کی حالتِ زار، عمارتوں اور باغوں کی تباہی و بربادی کا مقامی زبان میں خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نظیر کے لہجے سے دردمندی جھلکتی ہے۔ راسخ عظیم آبادی، شفیق اورنگ آبادی، سیاح، حسرت اور میر حسن نے متعدد شہر آشوب لکھے۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ اب شہر آشوب میں ہجو اور طنز کی جگہ مرثیے اور نوحے کا رنگ غالب آگیا۔ اس زمانے کے بیشتر شہر آشوبوں کا موضوع دہلی کی تباہی و بربادی ہے جن کے دو مجموعے کتابی شکل میں "فغانِ دہلی" مرتبہ محمد تفضل حسین کوکب ۱۲۸۰ھ اور "انقلابِ دہلی" مطبوعہ ۱۹۳۱ء